ائمہ وخطبا کی مشکلات، مسائل اور ذمہ داریاں

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام سیمینار۔۳

امولانا مفتی محمد طیب (مہتمم جامعہ امدادیہ، فیصل آباد)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، امابعد! فاعوذ بالله من الشیطٰن الرجیم۔ ربناتقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

جناب صدر مکرم، علماء کرام اور معزز حاضرین!

جس موضوع پہ یہ سیمینار رکھا گیا ہے، یہ موضوع انتہائی اہم بھی ہے اور انتہائی مشکل بھی۔ مساجد کے متعلق مسائل بھی بہت ہیں اور ضروریات بھی بے شمار ہیں۔ لیکن اس موضوع پر ہمارا کوئی اجتماعی فورم نہیں ہے کہ اس پر ہم اکٹھے ہو کر ان مسائل کو سوچیں اور غور کریں۔ ضرورت کا احساس ہے لیکن ساتھ مشکلات کو دیکھ کر ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہمارے فیصل آباد میں جمعیت المدارس ہے۔ ایک موقع پر مفتی زین العابدینؒ کے خلاف حکومت نے کوئی ایکشن لیا تھا، اس کے ردعمل میں یہ بنی اور پھر بنی رہی اور الحمدللہ اس کے کافی فوائد بھی حاصل ہوئے۔ گزشتہ سال مولانا ضیاء القاسمیؒ کے مدرسے پر حملہ ہوا اور اس کے ردعمل میں علما اس پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس سے پہلے قادیانیت کے موضوع پر جمع ہوئے اور قادیانیوں کی جو فیصل آباد میں ریشہ دوانیاں تھیں، ان کو پسپا ہونا پڑا۔ جمعیت المدارس کے لیے جب علما جمع ہوتے ہیں تو وہاں پر ہمارے پرانے بزرگ ہیں، قاری عبداللہ صاحب عالم بھی ہیں، قاری بھی ہیں۔ وہ ہر نشست میں کہتے ہیں کہ مساجد کے بڑے مسائل ہیں، آپ نے مدارس کے موضوع پر تو کمیٹی بنالی، لیکن مساجد کے بھی بہت مسائل ہیں۔ لیکن فیصل آباد کے علما نے اس موضوع پر سوچنے کی ابھی ہمت نہیں کی، کیونکہ مسائل ہی اتنے پیچیدہ ہیں۔ اسی طرح وفاق المدارس کی مجلس عاملہ کا جو آخری اجلاس کراچی میں ہوا، وہاں ایجنڈے میں ایک چیز وفاق المساجد بھی تھی کہ مساجد کا بھی ایک وفاق بننا چاہیے تو بات اسی پر آ کر ختم ہوئی کہ یہ ایسا مشکل موضوع ہے کہ اس کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے ائمہ اور خطبا کی تربیت کا کوئی نہ کوئی نظام بنا دیا جائے۔

واقعتاً یہ موضوع اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ اس لیے کہ مساجد اسلامی معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی مثال رکھتی ہے اور انبیاء کرام نے اپنے کام کی بنیاد مسجد کو بنایا ہے اور جس طرح مسجد کی اہمیت ہے، اس سے زیادہ مسجد میں بیٹھنے والے عالم کی اہمیت ہے۔ سب سے پہلی مسجد بیت اللہ کی ہے اور اس کی اہمیت قرآن پاک نے خود بیان کی ہے اور اللہ

نے اس کی تعمیر انبیا کرام سے کرائی اور اس کی شان یہ بتائی کہ ھدی للعالمین ہے۔ لیکن اس مسجد کی تعمیر کے بعد ابراہیمؑ کو جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ یہ ہے کہ اس مسجد کو آباد کرنے کے لیے رسول ہونا چاہیے، کتاب ہونی چاہیے، مدرسہ ہونا چاہیے اور یہ بیت اللہ کی جو عالمی حیثیت ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک نمایاں نہیں ہوئی۔ مکہ معظمہ شرک کا مرکز تھا۔ رسول اللہ کی بعثت اور آپ کی اکیس سالہ جدوجہد کے بعد پھر مکہ فتح ہوا اور مکہ کی وہ حیثیت (ھدی للعالمین) جو قرآن پاک نے بیان فرمائی وہ بحال ہوئی اور قیامت تک بحال رہے گی۔ تو مسجد جہاں اہم ہے، وہاں مسجد کا خطیب اور مسجد کا امام بھی بہت زیادہ اہم ہے۔

آج مسجدوں کے جو مسائل ہیں، ان میں ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اس وقت زیادہ مدارس علما دیوبند کے ہیں اور پھر طلبا کی تعداد بھی علما دیوبند کی زیادہ ہے تو اس کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ ان کی مساجد بھی زیادہ ہوں، لیکن مساجد ان کی زیادہ کیوں نہیں ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ فیصل آباد میں ایک مرتبہ علما بیٹھے تھے تو اس پر غور ہونا شروع ہوا۔ فرمانے لگے کہ جونئی کالونیاں بنتی ہیں تو شروع میں ایک دو مکان بنتے ہیں اور وہ ایک دو مکینوں کی بات نہیں ہوتی کہ وہ مسجد کو آباد کر سکیں اور دیوبندی عالم یہ چاہتا ہے کہ مجھے مسجد بھی ملے اور مکان بھی ملے، تب آ کر میں کام شروع کروں گا۔ ہمارے ملک کے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسجد کا پلاٹ چاہیے اور لاؤڈ سپیکر چاہیے اور اس کے بعد سارا کچھ خود بخود ہو جائے گا تو اس مجاہدے کے لیے اہل حق تیار نہیں ہیں اور جو لوگ تیار ہیں، وہ ان حالات میں آ کر پلاٹ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان کا کام چل جاتا ہے۔ اس لیے ان کی مساجد زیادہ ہیں ہماری نہیں ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ دیہاتوں میں کام بہت کم ہے۔ دیہاتوں میں جو مساجد ہیں، ان کا حال بہت خراب ہے۔ مساجد موجود ہیں، لیکن دیہات کے لوگوں کو کلمہ ٹھیک نہیں آتا، قرآن پاک صحیح نہیں آتا۔ دیہات میں جیسے دنیاوی اعتبار سے جہالت ہے، وہاں دینی اعتبار سے بھی جہالت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مدارس میں شہری زندگی میں رہ کر پڑھتے ہیں اور لوٹ کر دوبارہ دیہات کی زندگی میں جانا نہیں چاہتے۔ علما تو ہمارے کافی فارغ ہو رہے ہیں، لیکن دیہات میں نہیں جاتے۔ اس کی وجہ سے آج بھی دیہات میں شرک ہے، بدعات ہیں، رسومات ہیں۔ وہ سب اس وجہ سے ہیں کہ ہم دیہات میں پہنچتے نہیں ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ شہری زندگی میں ہم مساجد میں بیٹھے ہیں، لیکن مساجد میں بیٹھ کر لوگوں کو ہم دین نہیں سکھا رہے۔ لوگوں کو قرآن شریف پڑھانا، فقہی مسائل سمجھانا، دین کے سارے معاملات سمجھانا، پورے طور پر دین کے موضوع پر ہماری مساجد جو میں محنت ہونی چاہیے، وہ ہماری مساجد میں نہیں ہے۔ باقی ہمارے بھی مسائل ہیں۔ تنخواہ کم ہے، ملتا کم ہے، گزارا نہیں ہوتا۔ اس کا حل تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے، لیکن دین کا کام کرنا، دین کی محنت کرنا، جس مسجد میں ایک عالم بیٹھ جائے، اس کا گھر گھر قرآن وسنت کی روشنی پہنچانا، یہ سب کچھ اگر ایک عالم صحیح معنی میں ارادہ کر لے تو وہ کام کر سکتا ہے۔ لیکن ہمارا کام جمعہ کے خطبہ اور پانچ وقت کی نماز تک محدود ہوتا ہے۔ ہمارے اکابر نے قرآن پاک کا درس دیا ہے، لیکن آج بیشتر مساجد میں درس قرآن نہیں ہو رہا۔ آپ مشکوٰۃ شریف لے کر، ریاض الصالحین لے کر حدیث کا درس دینا شروع کریں تو لوگوں کو بہت سی دین کی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر مساجد کا سروے

کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بہت سی مساجد ہیں کہ جن میں درس حدیث کا کام نہیں ہو رہا۔ آپ فقہی مسائل کی کلاس لگا سکتے ہیں، لیکن فقہی مسائل لوگوں کو بتائے نہیں جا رہے۔ مساجد میں درس قرآن پاک، درس حدیث، فقہی مسائل، ناظرہ قرآن پاک، یہ وہ بنیادی کام ہیں جو آج ہماری شہری مساجد میں جہاں پر ہم موجود ہیں، نہیں ہو رہے۔

ایک کمی یہ ہے کہ بعض موضوعات کو ہم دوسرے فرقوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً اہل بیت ہیں، حضرت حسینؓ ہیں کہ ان کے متعلق گفتگو یا تو شیعہ کریں گے یا بریلوی کریں گے۔ ہمارے موضوعات میں یہ شامل نہیں ہے۔ ہمارے بزرگان دین میں بعض ایسے ہیں کہ ان کا کردار بہت اونچا ہے۔ مثلاً عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ ہیں اور یہ بڑے بڑے اکابر ہیں تو ان کے ایام ولادت یا ایام وفات آتے ہیں تو باقاعدہ پورے ہفتے منائے جاتے ہیں اور اس موضوع پر کلام کیا جاتا ہے، لیکن ہم ان موضوعات کو چھوڑ دیتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء دیوبند اہل بیت کا نام بھی نہیں لیتے اور اولیاء اللہ کا نام بھی نہیں لیتے۔ مجھے یہاں آ کر باتیں سن کر بہت فائدہ ہوا اور میں بیٹھے یہ تمنا کر رہا تھا کہ کاش میں صبح کی نشست میں بھی موجود ہوتا، آپ نے بھی استفادہ کیا ہے مجھے بھی فائدہ حاصل ہو جاتا۔

مولانا فرما رہے تھے کہ حالات حاضرہ کے متعلق بات کرنی چاہیے۔ حالات حاضرہ کے متعلق بات کرنے کے لیے ایک تو میڈیا کے ساتھ تعلق رکھنے کی ضرورت ہے، دوسرا اگر خطبات دیکھیں تو اپنے قریب کے ان بزرگوں کے جن کے ہاتھ امت کی نبض پر ہیں۔ اس سے ہمارے خطبات میں جان پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمارے موجودہ دور کے بزرگوں میں ایک بڑا نام ہے مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کا، ان کے خطبات ہیں اور ہمارے بزرگ مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بھی خطبات ہیں۔ ہمارے ماضی قریب کے بزرگوں میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا قاری محمد طیب صاحب، یہ وہ بزرگ تھے کہ جو معاشرے سے بے خبر نہیں تھے، امت کی نبض پر ان کے ہاتھ تھے۔ ان کی کتابوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے۔

میری آخری گزارش یہ ہے کہ آپ نے ایک بہت اہم اور مشکل موضوع کو چھیڑا ہے۔ میری تمنا ہے کہ گوجرانوالہ اس موضوع پر امامت کا کردار ادا کرے، اس موضوع کو آگے بڑھائے اور اس موضوع پر اکٹھے ہونے کی روایت ڈالے۔ اس کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جو بڑے بڑے ادارے ہیں، وہ پروگرام کی میزبانی کو بانٹ لیں کہ اس مہینے فلاں ادارے میں پروگرام ہوگا، دو مہینے بعد دوسرے میں، پھر تیسرے میں۔ اس طرح علما بھی اکٹھے ہوں گے اور موضوع بھی آگے بڑھے گا۔ رفتہ رفتہ صورتحال بھی نکھر جائے گی اور لائحہ عمل بھی سامنے آ جائے گا۔ یہ چند بکھری باتیں تھیں جو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت فرما رہے تھے کہ تجربات بھی بیان کرنے ہیں تو تجربات حضرت کے زیادہ ہیں، ان کی زندگی بھی زیادہ مسجد میں گزری ہے۔ حضرت امام اہل سنت کی تو ساری زندگی مسجد میں گزری ہے اور وہ ہمارے لیے ایک نمونہ بھی ہے کہ شیخ الحدیث کی مسند پر بیٹھے اور مسجد کی خدمت بھی کرے، امامت بھی کرے، یہ دونوں باتیں جمع ہو جانا بڑی بات ہے۔ میں اپنا تھوڑا سا تجربہ بیان کر دیتا ہوں۔ کراچی میں ۸۲ء میں، میں نے تخصص کیا تھا مفتی رشید صاحبؒ کے پاس۔ اس سے پہلے بنوری ٹاؤن میں دورہ کیا تھا۔ ایک دن میں دوپہر کو بنوری ٹاؤن آیا تو حضرت مفتی ولی حسن

صاحب نے فرمایا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہیں، یہ لیاری کے علاقے کے ہیں، آگرہ تاج کالونی کی جامع مسجد ہے تو یہ اس کے لیے خطیب چاہتے ہیں۔ آپ وہاں چلے جائیں۔ یہ وہ مسجد تھی جہاں سید عبدالمجید ندیم صاحب نے خطابت کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد بھی اسی معیار کے خطیب وہاں رہ چکے تھے اور مجھے اب بھی خطابت نہیں آتی۔ میں چلا گیا۔ شروع میں تو بڑی تنگی پیش آئی کہ وہ جس انداز کی خطابت تھی، وہ مجھے آتی نہیں تھی بلکہ ایک صاحب (مجھ سے پہلے جمعیت اشاعۃ التوحید والسنۃ کے ایک خطیب وہاں رہ چکے تھے) مجھے کہنے لگے کہ یہاں توحید بیان ہوا کرے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں بیان کروں گا۔

میں نے درس قرآن شروع کیا اور از خود لوگوں کو ناظرہ قرآن پاک پڑھانا شروع کیا، کسی اور کے ذمے نہیں لگایا اور پھر ناظرہ قرآن والوں میں سے ایک جماعت نکالی جن کو بہشتی زیور پڑھانا شروع کیا۔ تقریباً چھ پانچ مہینے میں وہاں رہا، اس کے بعد میرا تخصص ختم ہو گیا اور میں فیصل آباد واپس آ گیا اور ماضی قریب تک وہ لوگ یہ ہی کہتے رہے کہ آپ جب بھی کراچی آئیں تو یہ مسجد حاضر ہے۔ جب میں وہاں گیا تھا، وہاں پر فقہ کے مسائل اور دوسرے مسائل بہت محنت سے سکھائے اور اس کی وجہ سے بڑی تبدیلی آئی۔ اس علاقے میں جماعت اسلامی بہت مضبوط تھی۔ انہوں نے میری مخالفت شروع کر دی۔ ایک آدمی نے پوچھا کہ کیوں مخالفت کرتے ہو؟ ان کا قصور کیا ہے؟ کہنے لگے کہ انہوں نے ہمارے انداز سے کام کرنا شروع کر دیا ہے، اور کوئی بات نہیں ہے تو میں آپ کو یہ ہی پیغام دینا چاہتا ہوں کہ آپ جس مسجد میں بیٹھے ہیں، وہاں کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں، ان کو اپنا شاگرد بنائیں۔ دیہاتوں کی طرف رخ کرنے کی بہت ضرورت ہے، ادھر بہت کمی ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اور آپ کی حاضری کو قبول و منظور فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا عبدالخبیر آزاد (امام و خطیب بادشاہی مسجد، لاہور)

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

بہت ہی خوبصورت عنوان پر آج کی اس نشست کا الشریعہ اکیڈمی کی طرف سے انعقاد کیا گیا ہے۔ اس کے انعقاد پر میں حضرت شیخ الحدیث کا مشکور ہوں کہ یہ پروگرام آج کی ضرورت ہے بلکہ جیسا کہ مولانا فاروقی صاحب کہہ رہے تھے کہ ایک بڑے میدان میں اس پروگرام کو ہونا چاہیے اور ان شاء اللہ ہم راشدی صاحب کی سرپرستی میں پنجاب کی سطح پر اور پورے پاکستان کی سطح پر اس عنوان پر پروگرام کروائیں گے۔

یقیناً امام کے بہت سے مسائل ہیں۔ یقیناً آج چھوٹی جگہ کے امام کو بھی مسائل درپیش ہیں اور بڑی جگہ کا امام ہے تو مسئلہ اس کو بھی درپیش ہے، مگر بات وہی آ جاتی ہے جو حضرت استاذ الحدیث نے فرمائی ہے کہ امام کو طاقتور بننا ہے، امام کو مضبوط بننا ہے۔ آج کل معاشرے کے اندر سب سے زیادہ بگاڑ پیدا کرنے والی وہاں کی کمیٹی ہے اور آپ کو یہ بات بتا کر میں خوشی محسوس کروں گا کہ بادشاہی مسجد لاہور میں آج تک ہم نے کوئی کمیٹی بنانے نہیں دی ہے۔ چاہے وہ اوقاف کی مسجد ہے، لیکن ہم نے آج تک وہاں نہ تو کوئی کمیٹی بننے دی ہے اور نہ ہی ضرورت محسوس کی ہے۔ باقی اوقاف کی مساجد میں کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے والد صاحب حضرت مولانا عبدالقادر آزاد صاحبؒ بھی کمیٹی نہ بنانے کے حق میں تھے۔ جو مسائل امام کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں، وہ سب سے زیادہ مسجد کی کمیٹی پیدا کرتی ہے۔

امام معاشرے میں عزت وقدر کا نام ہے۔ وہی لوگ جو امام سے قرآن وحدیث سنتے ہیں، وہ اس کے پیروکار ہوتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ امام کو مضبوط ہونے کی ضرورت ہے۔ امام کی کیا حیثیت ہے؟ کیا مقام ہے، کیا بلندی ہے؟ اور اس کو کس منصب پر فائز کیا گیا ہے؟ مگر آج معاشرے نے اس امام کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے اور معاشرے نے اس کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک دیہات کا امام ہے، اس کو سال میں چالیس بوریاں گندم کی اور بیس بوریاں چاول کی دینی ہیں۔ اب اسی کو اکٹھا کرنے کے لیے لگا دیا اور اس کے لیے اتنا بڑا مسئلہ پیدا کر دیا کہ یہ مانگتا رہے گا تو گھر چلے گا اور پھر امام کو اس چیز پر لگا دیا کہ روٹی گھر سے آئے گی تو یہ کھائے گا اور جب کھائے گا تو ہم اس پر حکمرانی بھی کر سکتے ہیں تو یہ بہت سی چیزیں ہیں جو اکٹھی ہو جاتی ہیں۔

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ چاہے وہ مسجد پرائیویٹ ہو، چاہے گورنمنٹ کی ہو، ہم مضبوطی کے ساتھ، طاقت کے ساتھ اور اپنے اس بل بوتے پر کہ ہم نے جو علم سیکھا ہے، اس علم کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فرائض منصبی انجام دیں۔ ہمارے جو پہلے علما تھے، انہوں نے محنت کی اور اتنی محنت کی کہ وہاں پر کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ سچی بات ہے کہ ابتدا میں ہمارے علما نے جتنی محنتیں کیں، آج وہ ہم نہیں کر رہے۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ کچھ نمازیں پڑھائیں، کچھ نہ پڑھائیں۔ چلے گئے، اپنے دوسرے کاموں کا پورا کیا اور ان چیزوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ آج لوگ کیوں اس طرح کے نہیں بن رہے ہیں جیسا کہ ہمارے اسلاف یا ہمارے بزرگان دین جب کوئی بات کرتے تھے تو وہ بات لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی تھی اور لوگ جوق در جوق مسجدوں میں آتے تھے۔ مسجدیں آباد ہوتی تھیں، مگر آج مسجدیں خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو امام نے کام کرنا تھا، وہ بھی اس میں بخل کر رہا ہے۔

میں ہندوستان گیا۔ وہاں گول مسجد دہلی کے خطیب مولانا الیاس صاحب نے ایک تنظیم بنائی ہے، تنظیم ائمہ مساجد۔ وہ اسی لیے بنائی ہے کہ ائمہ کرام کے مسائل پر غور کیا جائے اور جہاں پر کوئی مسئلہ ہو، اس کو حل کیا جائے۔ میں تو وہاں سے یہ سوچ کر آیا تھا کہ جس طرح ہم دوسرے امور پر کام کر رہے ہیں، ہمیں اس موضوع پر بھی کام کرنا چاہیے۔ جب سے درسوں کا سلسلہ ختم ہوا ہے، لوگ بھی دور ہونا شروع ہو گئے ہیں، دور بھی ایسے ہوئے ہیں کہ مساجد میں آنا تک بند کر دیا ہے۔ امام کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ نماز پڑھنے تک رہ گیا ہے۔ درس دینے کا سلسلہ اور ذہن سازی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب محفل قراءت یا محفل نعت کا سلسلہ رہ گیا۔ پہلے جلسے ہوتے تھے تو حضرت امیر شریعت بات کر رہے ہیں، باقی علما بات کر رہے ہیں، ان کی بات دلوں پر اثر کرتی تھی۔ اس طرح ذہن سازی ہوتی تھی، اسی طرح ہمارے علما نے کام کیا۔ آج ہر امام کو چاہیے کہ وہ اس ضرورت کو محسوس کرے اور یقیناً جب وہ اس طرح کے کام اپنی مسجد میں کرے گا تو لوگ بھی بنیں گے۔ اسی طرح عقائد بھی سمجھائے جا سکتے ہیں۔ اگر کمیٹیاں محفل میں بیٹھیں گی تو ان پر بھی اثر ہوگا۔ جب ان کے عقائد درست ہوں گے تو وہ امام کے پیچھے ہوں گے اور امام ان کے آگے ہوگا۔ جس طرح عیسائیوں میں فادر کو رہبر ورہنما سمجھا جاتا ہے، سکھوں میں گرو کو رہبر ورہنما سمجھا جاتا ہے، ہندوؤں میں پنڈت کو رہبر ورہنما سمجھا جاتا ہے، اسی طرح امام کو دین اسلام نے اور حضرت محمد رسول اللہ کی امت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام کو بھی اپنے کام پورے کرنے چاہییں۔

امام کے ہوتے ہوئے ان کمیٹیوں کی بھی کیا ضرورت ہے؟ ان کو ختم کرنا چاہیے اور امام کو خود آگے بڑھنا چاہیے۔ نمازیں امام نے پڑھانی ہیں، خطیب امام ہے، سب کچھ امام نے کرنا ہے جبکہ کمیٹی کا چیئر مین کوئی چوہدری ہوتا ہے، کوئی جٹ ہوتا ہے، کوئی ارائیں ہوتا ہے۔ وہ کمیٹی کا صدر بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، پھر وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی بجائے یوں ہونا چاہیے کہ ڈویژنل سطح پر جو کمیٹیاں ہیں، ان کے چیئر مین بھی امام ہوں۔ یہ اتنا آسان کام تو نہیں ہے، لیکن جب امام خود چیئر مین ہوگا تو مسائل سارے اسی کے پاس آئیں گے۔

پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے اپنے ہی لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہو جاتے ہیں۔ ہمیں جو بھی مسئلہ پیش آتا ہے، وہ اپنوں کی وجہ سے آتا ہے۔ آج ان سب مسائل کو بھی درست کرنا ہے۔ جیسے حضرت نے فرمایا کہ ملک ٹوٹ گئے، وہ اسی وجہ سے ٹوٹے کہ اتحاد باقی نہیں رہ سکا کہ لوگ اپنی پلاننگ میں کامیاب ہوتے۔ آج بھی یہ ہے کہ ہم اپنی جنگ مسلک کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور ہمارے ہی لوگوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مسائل اپنے مفادات تک ہیں، مسلک کی مسلک جانے۔ جن کی وجہ سے ہمیں عزت ملی ہے، اگر ہم نے اس کی پہرہ داری نہیں کرنی تو پھر میرے اور آپ کے اس مسلک پر کھڑے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ الحمد للہ اپنے والد صاحب کی دعاؤں سے اور ان حضرات کی سرپرستی سے میرے پاس کوئی بھی آدمی مسئلہ لے کر آ جائے کہ ہمارا یہ مسئلہ ہے، آپ حل کروائیں تو میں الحمد للہ اس کے ساتھ ڈی آئی جی کے پاس جاتا ہوں۔ کمشنر کے پاس جاتا ہوں۔ اگر لاہور کا نہیں تو میں فون پر بات کرتا ہوں اور پھر اس مسئلے کو ہم ختم کراتے ہیں۔ کتنی ہی مساجد ہیں جن کے مسائل ہیں۔ ہم نے اس کو اسی لیول پر ختم کیا اور آج وہاں پر اسی طرح نظام اور سلسلے چل رہے ہیں۔

بائیس مسجدوں کے مسائل آئے۔ حضرت مولانا فاروقی صاحب اور حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب جانتے ہیں۔ وہ بھی اسی مجلس میں شامل تھے۔ حکومت پنجاب کی طرف سے کہا گیا کہ یہ بائیس مساجد مزارات کے ساتھ منسلک ہیں۔ چونکہ مزارات بریلویوں کے ہیں، لہٰذا یہ مساجد بریلویوں کو دے دی جائیں۔ اس کے بارے میں نوٹیفکیشن جاری ہو گیا تھا۔ میں حج سے واپس آیا تو اس مسئلے کو دیکھا۔ ایک ایک عالم کے پاس میں گیا اور کچھ سے فون پر بات کی اور یہ تحریک چلائی کہ ہم ایک مسجد بھی ان کے پاس نہیں جانے دیں گے اور اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے اس میں اپنی غیبی مدد کے ساتھ کامیابی عطا کی۔ میاں صاحب خود کہنے لگے کہ جو آرڈر میں نے دے دیے، وہ ٹھیک ہیں۔ باقیوں پر پھر بات کر لیں گے۔ مولانا قاری حنیف جالندھری صاحب نے کہا کہ باقیوں پر نہیں، اسی پر بات ہوگی۔ اس مسئلے کو لے کر میں چلا اور تقریباً پورے پنجاب کے علماء کرام کو لا کر میاں صاحب کے سامنے بٹھا دیا اور ان کو قائل کیا کہ یہ مسئلہ جو آپ کو بتایا گیا ہے، وہ غلط ہے۔ محکمہ اوقاف بننے سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد سے یہ مساجد علما دیوبند کے پاس ہیں اور یہ مزارات بھی دس پندرہ سال پہلے کے بزرگوں کے نہیں ہیں بلکہ سوڈیڑھ سو سال پہلے فوت ہونے والے بزرگوں کے ہیں اور اس وقت تو یہ مسلکوں کی بات بھی نہیں تھی، لہٰذا جس مسلک کے بھی علماء کرام آتے رہے، ان کے ساتھ یہ مزارات بھی منسلک رہے۔ پھر ہم نے وہ لسٹ بھی ان کو دی۔

ایسے ایسے مسائل ہیں جو ہم کو وہاں بیٹھ کر حل کرنے پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مصائب بھی آتے ہیں کہ یہ لوگ

ہر کام میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، اس کا کوئی حل کیا جائے۔ جب حل نظر نہیں آتا تو کوشش کرتے ہیں کہ ان میں سے دو چار آدمی لے لیے جائیں جو مفاد پرست ہوں، ان کو لے کر ان کو پیچھے کر دیا جائے، مگر ہونا وہی ہوتا ہے جو حکم ربی ہے، جو فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جو فیصلہ رب کر چکا ہے، اس کے فیصلے میں کوئی کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں کہ آپ کمیٹیوں کو جا کر فارغ کر دیں یا ان کا سر پھاڑ دیں بلکہ آپ حکمت عملی کے ساتھ، ہمت کے ساتھ ماحول بنائیں، ان شاءاللہ اس ماحول کی وجہ سے ایک وقت آئے گا کہ لوگ آپ کے ماتحت ہو جائیں گے۔

لاہور میں بادامی باغ کی مسجد کا مسئلہ آیا۔ وہاں ہر روز لڑائی ہوتی تھی۔ ایک گھر تھا جو دوسرے مسلک کا تھا، وہ تنگ کر رہا تھا، لڑائی کی طرف بات جا رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ لڑائی نہیں کرنی۔ ایک دن وہ وہاں جلوس لے آئے۔ ہمارے بھی سینکڑوں بندے وہاں جمع ہو گئے۔ دو تین مرتبہ انہوں نے وہاں پر جلوس بٹھائے۔ تبلیغی جماعت کی مسجد تھی اور ہم سے وابستہ تھی، ان کے امیر اس بات کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کو ادھر ہی ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ ادھر ہی فوت ہو گئے۔ اب پرچہ اس آدمی پر بھی ہوا اور آنے والوں سب پر ہوا۔ وہ دیوار بھی بنی اور مسجد بھی بن رہی ہے۔ ہمارے ایک ساتھی کی قربانی تو ہو گئی، مگر الحمدللہ وہ ناکام اور برباد ہوئے، کامیابی اللہ نے ہمیں دی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک دفعہ پہلے والد صاحب بادشاہی مسجد لاہور میں القاری الکبیر حضرت باسط صاحب کو لائے۔ بادشاہی مسجد میں ایک جم غفیر تھا۔ لوگ حیران تھے کہ اتنا ہجوم ہے تو بعض لوگوں نے کچھ کو شرارت کے لیے بھیجا۔ شرارت ہوئی، پھر مقدمات کا سلسلہ، پھر تحریک، تحریک میں یہ سب حضرات موجود تھے۔ آپ میں سے بھی کچھ گئے ہوں گے جنہوں نے ماریں کھائیں۔ اللہ نے ہمیں وہاں پر بھی فتح نصیب فرمائی۔

اللہ کا شکر ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلک دیوبند کی ترجمانی کر رہے ہیں اور دنیا کا کوئی کونا ایسا نہیں ہے جہاں پر مسلک دیوبند کا فرزند کام نہ کر رہا ہو اور ہر جگہ ائمہ اور خطبا کام کر رہے ہیں۔ تھوڑی اپنی ناچاقیاں ہیں، ان کو ختم کر دیں اور نچلی سطح پر ہمیں ضرورت ہے کہ ان کو ختم کر دیں۔ صحابہ کرام کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تعلیم تھی جس کی وجہ سے وہ آپس میں پیار اور محبت سے رہتے تھے، اس لیے اللہ نے قرآن پاک میں رحماء بینھم کہا کہ آپس میں پیار محبت سے رہتے ہیں۔ جب محبت کے ساتھ قافلے چلتے ہیں تو اللہ کی طرف سے فتح ونصرت کے باب کھلتے ہیں۔ میرا اور آپ کا وقار اس سے وابستہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم معاشرے میں ایک ایسا امام پیدا کریں کہ وہ اس معاشرے کے مسائل درست کر سکے اور اسی کی آج معاشرے کو ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ مدارس سکھا رہے ہیں، استاد اور اکابر سکھا رہے ہیں۔ جب ان کو مان کر چلیں گے تو عزتیں بھی ہیں، رفعتیں بھی ہیں، وقار اور بلندیاں بھی ہیں اور حق کا بول بالا بھی ہوگا۔

ابھی چند دن پہلے جرمنی کے شہر میونخ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں اسی (۸۰) ممالک سے لوگ آئے۔ وہاں پر جب میرا نام لیا گیا کہ سید عبدالخبیر آزاد امام بادشاہی مسجد لاہور آپ سے خطاب کریں گے تو میں نے وہاں پر وہ سارے مسائل بیان کیے جو دنیا کے لیے چیلنج ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ دہشت گرد پیدا ہو گئے ہیں،

کبھی آپ نے سوچا کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ آپ لوگ دوسرے ملکوں پر قبضے کر کے اور وہاں کے لوگوں کو تہس نہس کر کے، حملے کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ وہاں پر امن قائم کر رہے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن قائم ہو تو جنگوں کے ساتھ نہیں بلکہ ڈائیلاگ کے ساتھ ان مسائل کا حل نکالنا ہوگا۔ ہم پھر ہی دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسلام امن پسند اور محبت کو پھیلانے والا مذہب ہے اور آج ہمیں اپنے دین کے مطابق اپنے اپنے دین میں رہتے ہوئے اپنا کام کرنا ہے۔ اور بھی بہت کچھ بیان کیا تو یقین جانیں، تقریباً پندرہ منٹ تک لوگ تالیاں بجاتے رہے۔ تقریباً ہر مذہب کے لوگ وہاں موجود تھے۔

ہمارے والد کو امام السلاطین کا لقب ملا۔ آپ دیکھیں کہ جب اللہ قدر و منزلت بڑھانے پر آتا ہے تو بادشاہوں کا بھی امام بنا دیتا ہے۔ کراچی میں تمام بادشاہ پیچھے کھڑے تھے، وہ آگے کھڑے تھے۔ ایک جوڑا اسی کو دیکھ رہا تھا تو اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ شکل وصورت اچھی ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید کوئی بادشاہ ہے تو پتہ چلا کہ نہیں، یہ ایک فقیر درویش ہے جو ان کی امامت کرا رہا ہے۔ وہ جوڑا غیر مسلم تھا۔ ادھر ہی اس نے کلمہ پڑھا اور اسلام قبول کر لیا تو جب قدر و منزلت بڑھتی ہے تو دنیا کے اندر ڈنکا بجتا ہے۔ آج الحمد للہ علماء دیوبند ڈنکا بجا رہے ہیں اور ان شاء اللہ قیامت تک بجاتے رہیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے آپ کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں ایک دفعہ پھر مولانا زاہد الراشدی صاحب کا اور ان کے صاحبزادہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اتنے خوبصورت موضوع پر یہ نشست منعقد کی۔ ہمیں کام کرنا ہے، بلکہ ہم علما کی مشاورت کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھائیں گے بلکہ ہر سطح پر، ہر ڈویژن پر ایسی کمیٹیاں بنائی جائیں گی جو امام کی قدر و منزلت کو اجاگر کریں گی۔ ہمیں چاہیے کہ جو کوتاہیاں ہیں، ہم ان کو ختم کریں۔ جب ہم متحد ہو جائیں گے تو یہ سب لوگ ہمارے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ بہت کمزور لوگ ہیں۔ اللہ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا زاہد الراشدی (ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ)

سب سے پہلے تو میں مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے تاثرات، مشاہدات اور تجربات سے مستفید فرمایا۔ دو تین باتوں کے ساتھ میں بھی اس میں شرکت کرنا چاہوں گا۔ تجربات تو بہت ہیں، لیکن مشاہدات کی بات کروں گا۔

آج کل ہمارا بڑا مسئلہ ایک یہ ہے جو دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، خطبا کے لیے بطور خاص، کہ لوگ بالکل خطبہ کے وقت آتے ہیں، خطبہ سنتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہماری گفتگو سے سامعین کو زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔ اکثر مساجد میں یہی ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ میں عرض کرتا ہوں۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے جنگ اخبار برطانیہ میں ایک نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا۔ اس نے لکھا کہ اب ہم نے یہاں مساجد میں جانا کم کر دیا ہے، کیوں کہ اس کی تین وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ کہ خطیب صاحب جس موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، وہ ہماری دلچسپی کے موضوع نہیں ہیں۔ ہماری ضرورت کے مسائل اور ہیں۔ حلال وحرام کے مسائل، معاشرت، نکاح، طلاق کے مسائل ہیں اور وہ کسی اور موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے جو وہ کہہ رہے ہیں ان سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ یہ

ہے کہ جس زبان میں وہ بات کر رہے ہوتے ہیں، وہ ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ ان کی زبان اور ہے اور ہماری زبان اور ہے۔ یہ ادھر کا مسئلہ ہے کہ نئی نسل زبان کو نہیں جانتی۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم تو مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے ہیں اور تقریباً ہر نماز کے بعد کوئی صاحب اٹھتے ہیں اور اپیل کرنے لگتے ہیں یا دامن پھیلا دیتے ہیں تو ہم چندہ دینے تو نہیں جاتے، مسجد میں نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ ہر نماز کے بعد تو ہم چندہ نہیں دے سکتے۔ یہ تین وجوہات اس نے اپنے مراسلہ میں لکھی تھیں۔

ایک اور مشاہدہ عرض کرتا ہوں۔ برمنگھم میں ختم نبوت کانفرنس ہوتی ہے۔ وہاں گرمیوں میں صبح نو بجے سے لے کر شام آٹھ بجے تک وقت ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ وہاں کانفرنس ہوئی۔ میں نے بھی وہاں تقریباً بیس، پچیس منٹ بات کی۔ ہمارے پنجاب کے جسٹس نذیر غازی بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ختم نبوت میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ پنجاب کے ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل تھے، انہوں نے بھی وہاں تقریر کی۔ شام کو نو دس گھنٹے کی کانفرنس کے بعد جب عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہو کر نکل رہے تھے تو ایک نوجوان نے مجھے پکڑ لیا کہ مولوی صاحب میری بات سنیں۔ ہم صبح سے آئے ہیں، ثواب کی نیت سے آئے ہیں، ثواب کی نیت سے بیٹھے ہیں، سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آپ لوگوں نے کیا کہا ہے۔ کچھ آپ کی بات سمجھ میں آئی ہے اور کچھ نذیر صاحب کی تقریر سمجھ میں آئی ہے، باقی ہمیں کچھ پتہ نہیں چلا کہ آپ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

آج کی اصطلاحات، آج کے اسلوب، آج کی نفسیات بالکل مختلف ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے کے اسلوب سے زبان بدل گئی ہے، معیار بدل گیا ہے، محاورے بدل گئے ہیں، نفسیات بدل گئی ہیں۔ بات سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں۔ ہمارے بڑے مفکرین میں گزرے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان کی تقریر، ان کی خطابت اپنے دور کی پرشکوہ خطابت تھی، اپنے دور میں معیاری سمجھی جاتی تھی۔ آج اگر ان کے لہجے میں بات کریں تو لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ایک لطیفہ بھی ہے اس کے بارے میں، پتہ نہیں لوگوں نے خود گھڑا ہے یا واقعی سچ ہے۔ کہتے ہیں کچھ لوگ مولانا صاحب کے پاس آئے، انہوں نے بات پوچھی، کوئی سوال پوچھا۔ مولانا صاحب نے اپنے انداز میں کوئی جواب دیا جس میں آدھی فارسی، آدھی عربی تھی۔ آج سے پچاس سال پہلے کی گفتگو تھی، مشکل محاورے، مشکل باتیں۔ اس زمانے میں جتنی مشکل گفتگو ہوتی تھی، جتنے مشکل کوئی محاورے بولتا تھا، وہ اتنا ہی بڑا خطیب ہوتا تھا۔ مولانا صاحب نے ان دیہاتیوں کو اپنی زبان میں جواب دیا تو چوہدری اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ چلو بھئی چلتے ہیں، کیوں کہ مولانا صاحب تو اس وقت کوئی وظیفہ کر رہے ہیں۔ تو آج کی زبان وہ نہیں ہے۔ آج تو آپ سادہ لہجے میں بات کریں گے۔

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے گفتگو کا معیار یہ تھا کہ آپ نے عشا کی نماز کے بعد گفتگو شروع کی ہے اور صبح فجر ہو گئی ہے۔ لوگوں کو پتہ نہیں چلا ٹائم کا، لوگ آرام سے بیٹھے سن رہے ہیں۔ اب آپ آدھے گھنٹے سے زیادہ بات کریں گے تو لوگ کہیں کہ یہ کیا بور کر رہا ہے۔ مولوی صاحب بس وی کرو۔ سادہ لہجوں میں مختصر وقت میں آپ اپنی بات سمجھا سکتے ہیں یا نہیں سمجھا سکتے۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ نے مجھے خطابت پر لیکچر دیا تھا، اس کا صرف ایک جملہ میں

عرض کروں گا۔ مولانا فرمایا کہ ’’مولوی صاحب خطیب کینوں کہندے نیں؟ جے سامنے بیٹھے بندے تیری گل سمجھ دے نیں تے توں خطیب ایں، نہیں تے گھٹا تے سواہ ایں۔‘‘ آج خطابت یہ نہیں ہے کہ مولوی صاحب تقریر کر کے جائیں تو لوگ کہیں کہ واہ واہ بہت زبردست تقریر کی ہے۔ کیا کہا تھا؟ پتہ نہیں ہے۔

ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ لوگوں کے انس کی کمی کے اسباب کیا ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم لوگوں لوگوں کے مانوس لہجے میں بات نہیں کرتے، لوگوں کی نفسیات کے مطابق بات نہیں کرتے۔ ہماری خطابت وہی پرانی، مناظرانہ، مجادلانہ، طعن و تشنیع، بازو کس لینا، ہماری خطابت آج سے تیس سال پہلے والے سنٹر پر کھڑی ہے اور اب جو خطابت کے میدان میں تبدیلی آئی ہے، وہ ہم نے محسوس نہیں کی ہے، اس کو اپنایا نہیں ہے۔ آج کی زبان اور تحریر دونوں سادہ ہیں۔ جتنی سادہ اور مختصر آپ بات کریں گے، اتنے بڑے آپ خطیب ہیں۔ دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، یہ بات میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اب عام پڑھے لکھے لوگوں کے پاس بھی معلومات کا ذریعہ میں یا آپ نہیں ہیں۔ آج سے تیس، چالیس سال پہلے معلومات کا ذریعہ ہم ہی تھے۔ پڑھا لکھا آدمی بھی ہماری دی ہوئی معلومات کو ٹھیک سمجھ لیتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جھوٹی یا سچی، میرے علاوہ اور لوگوں کے پاس معلومات کے ذرائع بھی ہیں۔ کوئی انٹرنیٹ پر بیٹھا ہے، کوئی اخبارات پڑھتا ہے، میگزین پڑھتا ہے، چینل پروگرام دیکھتا ہے۔ میں غلط یا صحیح کی بات نہیں کر رہا، لیکن اس کی معلومات کا دائرہ ہم سے وسیع ہے۔ آج کے اس میڈیا کے پھیلاؤ نے ایک عام آدمی کو معلومات کی بہت سی کھڑکیاں دے دی ہیں۔ وہ اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے ایک بٹن کلک کرتا ہے، ایک طرح کی معلومات لے لیتا ہے۔ دوسرا بٹن کلک کرتا ہے، دوسری طرح کی معلومات لے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ آپ سے مسئلہ پوچھتا ہے۔ ہمیں اپنے قارئین کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرنا پڑے گا۔ ہمیں معلومات کے ساتھ محاکمہ بھی کرنا پڑے گا۔ عام آدمی صرف معلومات پر فیصلہ کرے گا۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہمارے پاس جو معلومات ہیں، ہم اس پر ٹھیک فیصلہ کریں کہ یہ ٹھیک اور یہ دلیل شرعی کی بات ہے اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہم یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔ نہ لوگوں کی ذہنی سطح پر آ رہے ہیں، نہ ہماری معلومات کا دائرہ وسیع ہے۔ ہم تو بہت سی جگہوں پر خارجی مطالعہ کو ویسے بھی حرام سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسئلہ پر میں معلومات لے رہا تھا۔ ایک کتاب تھی جو ایک دینی مسئلے پر تھی اور کسی پروفیسر کی لکھی ہوئی تھی۔ ایک صاحب مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ مولوی صاحب! آپ یہ کتابیں پڑھتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں بھئی پڑھتا ہوں۔ معلومات تو جہاں سے بھی ملیں، لے لینی چاہییں۔ دیکھیں، لوگ ہمارے پاس کس لیے آتے ہیں؟ دینی معلومات لینے کے لیے۔ خطبے یا جمعے کیوں سنتے ہیں، درس کیوں سنتے ہیں؟ اگر وہی بات اس کو رات کو کسی چینل میں مجھ سے اچھے لہجے میں مل جائے تو وہ میرے پاس کیوں آئے گا؟ میں اسلوب کی، لہجے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ بات مجھ سے اچھے لہجے میں نے رات کو کسی چینل میں سنی ہے تو وہ میری بات سنے گا یا چینل کی بات سنے گا؟ وہ کہے گا کہ وہی بات رات انہوں نے بڑی اچھی کی تھی۔ بات صرف اسلوب کی ہوتی ہے، لہجے کی ہوتی ہے، شائستگی کی ہوتی ہے۔ جو بات میں لڑائی کے انداز میں کر رہا ہوں، وہ رات چینل میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی بڑی محبت کے انداز میں کر رہا ہوتا ہے تو سننے والے کو وہ بات پسند آ جاتی ہے کہ اس نے کتنی اچھی بات کی ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ حالات کے رخ پر جو تبدیلیاں ہیں، ان کو محسوس کرنا چاہیے۔ حالات کے مطابق ڈھلنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اپنا موقف، اپنا مذہب یا اپنا عقیدہ چھوڑ دوں۔ نہیں، بلکہ اپنے لہجے کو، اسلوب کو، اپنی گفتگو کے انداز کو، تحریر کے انداز کو آج کے حالات کے مطابق اپنانا ہوگا۔ ہم لوگ درس نظامی میں بڑے شوق سے مقامات حریری اور مقامات ہمدانی پڑھتے ہیں۔ آج اس زبان میں آپ خطبہ دیں گے؟ وہ ہزار سال پہلے کی زبان ہے، اس دور کی زبان سے واقفیت کی اپنی افادیت ہے۔ لیکن آج اگر حریری کا کوئی خطبہ آپ نقل کر لیں تو لوگ کہیں گے کہ مولوی صاحب وظیفہ کر رہے ہیں۔ آج کا اسلوب اختیار کریں، لوگوں کی ذہنی سطح سمجھیں۔ لوگوں کے ہم سے دور ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے جو میں نے بیان کیا ہے۔

میں آخر میں یہ کہوں گا کہ جو کچھ علماء کرام نے تجاویز پیش کیں ہیں، ہم ان کو مرتب کر کے شائع کریں گے اور یہ سیمینار ہمارا آخری سیمینار نہیں ہے، ان شاء اللہ جب تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے، ہم یہ سیمینار چلاتے رہیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے، آپ کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ ایک جامع رپورٹ آئے گی کہ امہ اور خطبا کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے۔ میں آخر میں سب حضرات کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں اور خدا حافظ کہتا ہوں۔

سنی موقف

جو سپریم کورٹ آف پاکستان میں پیش کیا گیا

—— مرتب: مولانا علی شیر حیدری شہیدؒ ——

[صفحات: ۱۳۲۔ قیمت: ۶۰ روپے]

مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے

’’دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل، امکانات‘‘

— از قلم: پروفیسر سلیم منصور خالد —

جنوبی ایشیا میں دینی تعلیم کی روایت، دینی مدارس کے موجودہ نظام کا شماریاتی جائزہ، طلبہ کا سماجی پس منظر، خدمات اور مجوزہ اصلاحات، مدارس کے خلاف الزامی مہم، تدریسی نظام، درپیش مسائل ومشکلات، حکومت اور دینی مدارس، نصاب تعلیم اور دیگر پہلوؤں کو محیط ایک باحوالہ، مفصل اور مستند دستاویز

[صفحات: ۴۷۲۔ قیمت: ۲۰۰ روپے]

(مکتبہ امام اہل سنت پر دستیاب ہے)